ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

محمد فیضان عادل، لیکچرار، کاسٹ کالج، ساہیوال

پروفیسر ڈاکٹر عمران ظفر چیئرمین شعبہ اردو، گورنمنٹ گریجویٹ کالج جھنگ

"گنجی بار" کی ثقافت کے تناظر میں "مانگی ہوئی محبت" کا مطالعہ

The Study of "Mangi Hoi Mohabat" in the Context of the Culture of the "Ganji Bar"

M. Faizan Adil , Lecturer CAST College, Sahiwal

Prof. Dr.Imran Zafar,Chairman, Urdu Department,Govt Graduate College Jhang.

Abstract

The forest is called "bar" in punjabi language.Some areas of punjab are divided into five major "bars" . These include "Gondal bar","Krana bar", "Sandal bar", "Nelli bar" and "Ganji bar". "Ganji bar" is called the middle area of river "Beas" and "Ravi". Some areas of district khanewal, district sahiwal and district okara are included in it.Civilization and culture are known to every society. The culture of any region is as old as the history of the people there. When we talk about the difference between culture and civilization, the culture recognizes a human being, which society, area or class belongs to, while the development of civilization is made by society, good culture, science and industry."Mangi Hoi Mohabat", is the novel of "Muhammad Iqbal Abid". After reading "muhammad iqbal abid", it is estimated that he is living in his civilization. Their style brings the fragrance of culture. They have made it so interesting by bringing the ancient memories in a modern way that the reader remains in it. In the writings of "muhammad iqbal abid", his observation, memory, reading, experience and interest appear clear. They descend into the depth of their culture and culture, and the rays are scattered in every corner. Their thoughts are not less than a milestone for future generations.

Keywords:Civilization, Society, Development, Industry, Ancient, Thoughts.

. جنگل کو پنجابی زبان میں بار کہا جاتا ہے۔ پنجاب کے کچھ علاقوں کی پانچ بڑی باروں میں تقسیم کی گئی ہے۔ جن میں گوندل بار، کرانا بار، ساندل بار، نیلی بار اور گنجی بار شامل ہیں، موجودہ دور میں کئی اور بھی چھوٹی چھوٹی باریں بنائی گئی ہیں۔ ایسے جنگلی علاقے جن میں کھیتی باڑی کے ذرائع نہیں تھے اور یہاں زیادہ تر جنگلات اور زہریلے جانور پائے جاتے تھے۔ لیکن پھر

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

نہری نظام کی آباد کاری کے بعد باریں تشکیل دی گئی۔ ان علاقوں میں بولی جانے والی زبان رچناوی ہے، جسے قدیم پنجابی زمینداروں کی زبان بھی کہا جاتا ہے۔

گوندل بار میں منڈی بہاوالدین اور پھالیہ کا علاقہ شامل ہے۔ کرانا بار میں جھنگ کا اوپر والا حصہ (جو سرگودھا کہ ساتھ لگتا ہے) اور ضلع سرگودھا شامل ہیں۔ ساندل بار میں ملحقہ جھنگ کے علاقے، شیخوپورہ، فیصل آباد اور ٹوبہ ٹیک سنگھ شامل ہیں۔ نیلی بار ستلج اور بیاس کا درمیانی علاقہ ہے جس میں عارفوالہ، پاکپتن، اور ساہیوال کے کچھ علاقے شامل ہیں، چونکہ دریائے ستلج کا پانی نیلگوں ہے اس لئے علاقائی طور پر اسے نیلی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس علاقے کی نیلی راوی بھینس بھی بہترین نسل سے پہچانی جاتی ہے۔

گنجی بار دریائے بیاس اور راوی کے درمیانی علاقے کو کہا جاتا ہے۔ ضلع خانیوال، ضلع ساہیوال اور ضلع اوکاڑہ کے کچھ علاقے اس میں شامل ہیں۔ گنجی بار کے بارے میں کہا جاتا ہے نہری نظام سے قبل یہ علاقے بالکل غیر آباد تھے اسی لئے انہیں گنج سے گنجی بار کا نام دیا گیا۔ اسد سلیم شیخ "گنجی بار" کے بارے میں لکھتے ہیں کہ۔

> گنجی بار دریائے بیاس کی پرانی گزرگاہ اور راوی کے درمیانی علاقے پر مشتمل ہے۔ موجودہ ضلع ساہیوال، خانیوال اور اوکاڑہ اس میں شامل ہیں۔[1]

تہذیب و ثقافت ہر معاشرے کی پہچان ہوتی ہے اس کے ساتھ زبان اور قوم اہم کردار ادا کرتی ہے۔ کسی بھی خطے کی ثقافت اتنی ہی پرانی ہوتی جتنی وہاں کے لوگوں کی تاریخ۔ ثقافت اور تہذیب میں فرق کی بات کی جائے تو ثقافت کسی انسان کی پہچان کرواتی ہے کہ یہ کس معاشرے، علاقے یا طبقے سے تعلق رکھتا ہے جبکہ تہذیب معاشرے کی ترقی، عمدہ ثقافت، سائنس اور صنعت سے مل کر بنتی ہے۔ ثقافت کے عناصر میں سب سے پہلے آبادی آتی ہے پھر یادگار فن تعمیر اور منفرد قسم کے آرٹ، علاقوں کی بہتری کے لئے کئے گئے انتظامات اور پھر سماجی اور معاشی حوالے سے طبقات میں تقسیم شامل ہیں۔ عوام، حکومت، مذہب اور فن اور فنون ایسے جز ہیں جس سے مل کر ایک ثقافت تشکیل پاتی ہے۔ یہ تمام ایسی چیزیں ہیں جو مل کر ایک مہذب معاشرہ بناتی ہیں۔ اگر ہم ثقافت کی اہمیت کے حوالے سے بات کریں تو یہ بات نہیں جھٹلائی جا سکتی کہ اعلیٰ

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

معیار کی ریاست ہی ثقافت ہے۔اس کی بنیاد اخلاقیات، حکومت کے استحکام اور معیاری تحریریں مل کر رکھتی ہیں۔ تہذیب و ثقافت کی تعریف کرتے ہوئے سبط حسین لکھتے ہیں کہ۔

> " تہذیب معاشرے کی طرزِ زندگی اور طرزِ فکر و احساس کا جوہر ہوتی ہے۔ چنانچہ زبان، آلات و اوزار، پیداوار کے طریقے اور سماجی رشتے، رہن سہن، فنونِ لطیفہ، علم و ادب، فلسفہ و حکمت، عقائد و افسوں، اخلاق و عادات، رسوم و روایات، عشق و محبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات وغیرہ تہذیب کے مختلف مظاہر ہیں۔"(2)

موجودہ دور میں مشرقی تہذیب کے حوالے سے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری آنے والی نسلیں مغرب سے زیادہ متاثر نظر آتی ہیں اب اس کے قصور وار ہم خود ہیں یا کوئی اور اس بات پر الگ سے لمبی بحث کی جا سکتی ہے، مختصر یہ کہ پہناوے سے لے کر کھانے تک تمام ترجیحات ہماری مغربی تہذیب سے مانوس ہیں، جس کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ ہم نسل در نسل مغربی غلام بنتے جا رہیں اور اس پر ہماری سرزنش کرنے والا بھی کوئی نہیں بلکہ ہم اسے روشن خیالی اور جدیدیت کا نام دے رہے ہیں۔ اخلاقی لحاظ سے ہم پسماندگی کا شکار ہو رہے ہیں اور ہماری روایات اور تہذیب آئے دن ذہنی گرفت سے دور ہوتی جا رہی ہے۔

"مانگی ہوئی محبت"، "محمد اقبال عابد" کا ناول ہے۔ "محمد اقبال عابد" 1967ء میں ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ، تحصیل کمالیہ کے موضع رام پور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول تلمبہ سے اور پھر گورنمنٹ کالج میاں چنوں اور ایمرسن کالج ملتان سے تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے بطور معلم گورنمنٹ ہائی سکول سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے بعد انہوں نے گورنمنٹ کالج آف کامرس چیچہ وطنی میں بطور استاد 15 سال اپنے فرائض سر انجام دیے۔ پروفیسر غلام حسین ساجد "محمد اقبال عابد" کے بارے میں لکھتے ہیں کہ۔

> "اس ناول کو پڑھتے ہوئے مجھے ہر من میسے، شوکت صدیقی، عبداللہ حسین اور ہائیلو کوہیلو کی یاد آتی رہی۔ کہیں پلاٹ کی جمیل ندرت، کہیں آبائی مٹی اور دانش سے وہی نسبت، کہیں

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

بیانیے کی پر تاثیر روانی، کہیں روحانی علویت اور بے مثل تاثیر اور کہیں ایک بے خطابنت کاری کی وجہ سے۔ مگر محمد اقبال عابد کا اسلوب سب کی یاد دلاتا ہوا بھی سب سے مختلف ہے کہ اس کی بنیاد مٹی سے جڑے ہوئے لوگوں اور اپنی جڑوں سے پیوست کرداروں کے طرز عمل اور تہذیبی رویوں پر ہے۔"(3)

"محمد اقبال عابد" کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی تہذیب میں رچے بسے ہوئے ہیں۔ ان کے اسلوب سے ثقافت کی خوشبو آتی ہے۔ انہوں نے قدیم یادوں کو جدید طریقے سے سامنے لا کر اسے اتنا دلچسپ بنا دیا ہے کہ قاری اس میں محو ہو کر رہ جاتا ہے۔ "محمد اقبال عابد" کی تحریروں میں ان کا مشاہدہ، یاداشت، مطالعہ، تجربہ اور دلچسپی واضح نظر آتی ہے۔ وہ اپنی تہذیب و ثقافت کی گہرائی میں اترتے ہیں اور ہر کونے میں کرنیں بکھیرتے نظر آتے ہیں اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے اپنی ثقافت کو نکھارا اور سنوارا ہے تو کچھ غلط نہ ہو گا۔ ان کے افکار آنے والی نسلوں کے لیے کسی سنگ میل سے کم نہیں ہیں۔

"محمد اقبال عابد" نا صرف ماضی کو حال سے ملانے میں کامیاب ہوئے ہیں بلکہ مستقبل کو دکھانے میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کے ہاں الفاظ کا تسلسل، افکار کی سچائی اور خیالات کے نکھار کو خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے۔

ناول میں گنجی بار کی ثقافت کی عکاسی کی گئی ہے اور گنجی بار کے لوگوں کی مصروفیات، اخلاقیات اور رہن سہن کے طریقوں کی عمدہ منظر نگاری کی گئی ہے۔ ناول میں "گنجی بار" کے باسیوں کے تہذیبی و ثقافتی خدوخال کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ناول کے بارے میں پروفیسر منیر ابن رزمی لکھتے ہیں کہ۔

"مانگی ہوئی محبت۔۔۔۔ میں قصہ پن کا تار کہیں سے ٹوٹا نہیں ہے بلکہ بدرجہ اتم موجود ہے اور ناول نگار نے جس انداز سے "کہانی" کو بیان کیا ہے وہ انتہائی متاثر کن ہے اور ناول نگار کے بنائے گئے مناظر، اتنے متحرک ہیں کہ قاری ماضی بعید کے ان دل کش مناظر کے سحر انگیز بیانیے میں کھو جاتا ہے۔ کردار نگاری کے ساتھ منظر نگاری بھی بہت عمدگی سے کی گئی ہے۔"(4)

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

حقہ زمانہ قدیم سے بالخصوص دیہاتی علاقوں کی اور ڈیروں کی رونق رہا ہے۔ جس گھر یا ڈیرے میں حقہ نہیں ہوتا تھا اس کے لئے بڑی شرم کی بات ہوتی تھی کہ اگر کوئی مہمان آئے تو اسے حقہ پیش کیا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں جیسے ہر چیز جدیدیت کی طرف آ رہی ہے اسی طرح حقے کی جگہ سگریٹ، شیشہ اور ایسے ہی کئی جدید آلات لے چکے ہیں۔ اسی طرح موجودہ نسل نے حقے کا نام تو شاید سنا ہو لیکن انہیں اس کے مختلف حصوں کے نام اور اسے تیار کرنے کے طریقے نہیں معلوم ہوں گے۔ ہر مصنف کی تحریر سے اس کا اپنا پن جھلکتا دکھائی دیتا اور معلوم ہوتا کہ وہ اپنی ثقافت کے ساتھ کس قدر جڑا ہوا ہے۔ اسی طرح ناول "مانگی ہوئی محبت" میں مصنف حقے کے ایک ایک حصے کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

ناول میں ایک آرزو نامی کردار ہے جو تلمبہ کے رسموں رواجوں کے بارے میں سکندر سے پوچھ رہی ہوتی ہے تو وہ اسے جواب دیتا ہے کہ یہاں کے حقے بہت مشہور ہیں۔ سیچے، نڑی، پُھل۔ سبھی بہت اعلیٰ بنتے ہیں۔۔۔۔ تو آرزو بڑی حیرت سے پوچھتی ہے کہ یہ کیا چیزیں ہیں۔

> "یہ سیچے اور کیا نام لے رہے ہیں آپ یہ کیا چیزیں ہیں؟ آرزو نے حیرت سے پوچھا۔ سکندر نے اِدھر اُدھر دیکھا اور چوہلانے کی دیوار کے ساتھ لگے پڑے حقے کو اٹھالایا۔ یہ پھل ہے، یہ جس میں آگ کے انگارے ڈالے جاتے ہیں۔ انگاروں کے نیچے اور تمباکو کے اوپر کا پھورا یعنی برادہ سا رکھا جاتا ہے تاکہ حقے کا دھواں گلے کو تکلیف نہ دے۔ اس سے نیچے تمباکو اور تمباکو کے نیچے یہ جو ٹھیکری پڑی ہے۔ اسے چُگل کہتے ہیں۔ اور یہ نیچے جو پیتل کی بنی ہوئی دو نالیاں ہیں جن میں نیچا ڈالا ہوا ہے اسے ڈَنا کہتے ہیں جی اور یہ جس سے منہ لگا کے کش لگاتے ہیں اس کو نڑی کہتے ہیں۔"(5)

پنجاب کو پنجاب اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ اسے پانچ دریا سیر اب کرتے ہیں۔ ان دریاؤں میں دریائے بیاس، دریائے جہلم، دریائے چناب، دریائے راوی اور دریائے ستلج شامل ہیں۔ "گنجی بار" کے علاقے کو جو دریا سیر اب کرتا ہے وہ راوی ہے۔ دریائے راوی کی لمبائی 720 کلو میٹر ہے۔ دریائے راوی کو پہلے دریائے ایراوتی کہا جاتا تھا پھر اس کا نام راوی رکھ دیا گیا۔ یہ درہ

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

روتنگ ضلع کانگڑ سے نکلتا ہے اور پاکستان میں داخل ہوتا ہے۔ اگر ہم دریائے راوی سے نکلنے والی نہروں کی بات کریں تو سب سے پہلے بھارت مادھور پور سے اپر باری دوآب نکلتی ہے۔ پھر جب دریا پاکستان میں داخل ہوتا ہے تو سب سے قصور برانچ ہے ۔اس کے بعد بلوکی سے نہر لوئر باری دوآب نکلتی ہے جو ساہیوال سے ہوتی ہوئی ملتان کے اضلاع تک جاتی ہے چونکہ یہ علاقہ بہت بڑا تھا اس لئے صرف ایک نہر کا پانی اس کے لئے کافی نہ تھا تو پھر بلوکی کے مقام پر دریائے چناب سے ایک نہر نکال کر پانی دریائے راوی میں شامل کیا گیا جس سے راستے میں آنے والے تمام علاقوں کی سیرابی ممکن ہوئی۔ لیکن اس کا نقصان یہ ہوا کہ نہر لوئر چناب کا پانی کم ہو گیا اور فیصل آباد، گوجرانوالہ، شیخوپورہ اور جھنگ کے علاقوں کے پانی کم ہو گیا لیکن جلد ہی اس کا حل بھی نکال لیا گیا اور دریا چناب کو خانکی کے مقام پر منگلا سے ملا دیا گیا جس سے یہ کمی بھی پوری ہو گئی۔ ان دریاوں اور نہروں کی بدولت یہ تمام وہ علاقے ہیں جہاں امریکن کپاس، گندم، مکئی اور کماد کی عمدہ کاشتکاری کی جاتی ہے۔

دریائے راوی کے حوالے سے علاقائی طور پر یہ بات مشہور وہ کچھ سالوں بعد اپنا راستہ تبدیل کرتا ہے۔ اس کے پرانے راستے کو مقامی لوگ بڈھا راوی کہتے ہیں۔ ناول "مانگی ہوئی محبت" میں بھی راوی کی تاریخ کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ جہاں "آرزو"، "غوث" سے پوچھتی ہے کہ جہاں ہم کھڑے ہیں یہاں سے دریا کس طرف ہے اور لاہور کس طرف۔

> ہم لاہور سے مغرب کی طرف ہیں۔ اور یہ راوی لاہور سے گزر کر ہی آتا ہے۔ یہ انڈیا سے نکلتا ہے۔ انڈیا کا ضلع ہے کانگڑہ۔ وہاں سے نکلتا ہے اور جہاں ہم کھڑے ہیں یہاں آگے کوئی دس پندرہ میل، یہ دریائے چناب میں شامل ہو جاتا ہے۔ رگ وید میں اس دریا یعنی راوی کا نام ایراوتی لکھا ہے۔ اسی نسبت سے یہاں سے دس کلومیٹر دور ایک قصبہ ہے اس کا نام اروتی ہے۔ جو ایراوتی سے بدل کو اروتی ہوا۔۔۔۔ اور یہ کئی بار راستے بدل چکا ہے۔ (6)

"گنجی بار" کا علاقہ اپنی تاریخ کے حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں پاکستان کا دوسرا مصنوعی جنگل بھی ہے۔ اس علاقے سے بڑے بڑے دانشوروں، سیاست دانوں اور روحانی پیشواؤں کا تعلق رہا ہے۔ یہاں مجید امجد، منیر نیازی، مہدی حسن، اشفاق احمد اور طارق عزیز عظیم لوگوں نے پرورش پائی۔ نیلی راوی بھینس بھی اسی علاقے کی ہے جسے دنیا کی

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

سب سے زیادہ دودھ دینے والی بھینس کہا جاتا ہے ۔اس کے علاوہ سنٹرل جیل ساہیوال ایک ایسی جیل ہے جو انگریزوں کی بنائی ہوئی پہلی جیل ہے ، جہاں مولانا ظفر علی خان، ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لعل نہرو، آغا شورش کاشمیری، سید ابوالاعلیٰ مودودی، شیخ مجیب الرحمن، ذوالفقار علی بھٹو اور فیض احمد فیض قید رہے۔ اگر انگریزوں کی بات کی جائے تو ساہیوال جس کا نام منٹگمری بھی رکھا گیا ان کے لئے خاصی اہمیت کا حامل تھا۔ اس کے علاوہ بہت سے سورمے بھی اسی علاقے میں پیدا ہوئے جنہوں نے انگریزوں کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ہڑپہ میوزیم بھی اسی علاقے میں جسے پہلی منظم تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ فصلوں کے حوالے سے بھی اس خطے کا کوئی ثانی نہیں گندم، کپاس، گنا، مکئی اور سبزیاں سمیت تمام چیزیں یہاں کثیر تعداد میں اگائی جاتی ہیں۔ تاریخ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قائد اعظم کے اباؤ اجداد بھی یہی سے تعلق رکھتے تھے جس کا ذکر ناول "مانگی ہوئی محبت" میں بھی کیا گیا ہے، جہاں "غوث"، "آرزو" کو اس علاقے کے بارے میں بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ۔

> ساہیوال کی اور بھی ایک اہم بات ہے وہ یہ کہ جہاں ہم جا رہے ہیں ناں، ہڑپہ، اس کے قریب ایک جگہ ہے میر داد معافی چھوٹا سا قصبہ ہے، اس جگہ پر قائد اعظم محمد علی جناح کے آباؤ اجداد رہتے تھے۔ یہاں ان کے ایک بزرگ کاٹھیاوار شفٹ ہوئے تھے۔۔۔۔۔ قائد اعظم نے خود کہا تھا کہ میں پنجابی مسلمان ہوں۔ راجپوت ہوں۔ اور منٹگمری ضلع جو ساہیوال کا پرانا نام تھا، میں رہے میرے آباؤ"(7)

جب انسان زندہ ہو تو بے شک وہ در در کی ٹھوکریں کھاتا پھرے لیکن مرنے کے بعد اس کے لئے ایسے ایسے اقدامات کئے جاتے ہیں کہ اگر اس کے زندہ رہتے ہوئے کئے جاتے تو یقیناً وہ خوشی خوشی اس دنیا سے جاتا۔ مردہ پرست کا لفظ ہماری قوم کے لئے ایجاد کیا گیا ہے۔ اکثر لوگ در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہوتے ہیں ان کو دو وقت کا کھانا نصیب نہیں ہوتا وہ بھوک سے بلک بلک کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں ان کی اپنی اولادیں ان کی خیر تک نہیں پوچھتی، لیکن جونہی ان کی وفات ہو تو ہر کوئی محبت دکھانے کے لئے پہنچ جاتا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد ایسی ایسی فضولیات کی جاتی ہیں کہ خدا کی پناہ۔

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

افسوس تو اس بات کا ہے کہ اس وقت بجائے کسی غریب کی مدد کرنے، کسی بھوکے کو کھانا کھلانے اور کسی لاچار کی دادرسی کرنے کی بجائے فوتگی کی دعوت وہ تمام لوگ اڑاتے ہیں جو کسی بھی طرح سے اس کے حق دار نہیں ہوتے ان میں رشتہ دار، دوست احباب اور محلے دار شامل ہوتے ہیں۔ ورثا بھی جب وہ زندہ ہوتا ہے تو اس کی قدر نہیں کرتے لیکن اس کے مرنے کے بعد اب طرح طرح کے کھانے پکا رہے ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ لوگ یہ اعتراض نہ کریں کہ اس کے مرنے پر ورثا کی طرف سے اچھے انتظامات نہیں کیے گئے۔

یہ کھیل صرف یہی نہیں ختم ہوتا اس کے بعد مرنے والے کے لئے اس کے جوتے، کپڑے اور تمام ضرورت کی چیزیں بھی لی جاتی ہیں جو ختم میں رکھی جاتی ہیں اور ایک طرح کا جہیز اکھٹا کیا جاتا ہے اور باقاعدہ اس کی نمائش کی جاتی اور تمام لوگ دیکھتے اور پھر اس پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ رائے ورثا کے لئے بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے کیونکہ اسی رائے کی بنیاد پر فیصلہ ہوتا ہے کہ تمام انتظامات عمدہ تھے یا نہیں اس تمام عمل کے پیچھے مرحوم کو فائدہ یا ایصال پہنچانا مقصد نہیں ہوتا بلکہ معاشرے میں تعریف کروانا ہوتا ہے۔ "محمد اقبال عابد" بھی ایسے ہی ایک منظر کو پیش کرتے ہیں جب "آرزو" کو مقامی عورتیں اپنے رسموں رواج کے بارے میں بتا رہی ہوتی ہیں۔

> "آرزو بہن حال دیکھیں یہاں کی عورتوں کا۔۔۔۔ ہمارے ہاں جب قل خوانی ہوتی ہے، ساتویں آٹھویں دن، اس دن عورتوں کی علمیت کا تماشا دیکھنے والا ہوتا ہے۔۔۔۔ اگر عورت مری ہو تو اس کے ناپ کی جوتی، کپڑے، اس کے لئے چارپائی بستر، سب کچھ چارپائی پر سجا کر ایسے نمائش کرتی ہیں جیسے ہمارے یہاں جہیز کی نمائش ہوتی ہے۔ پچھلے سے پچھلے سال ایک مائی فوت ہوگئی۔ سب کچھ تھا، مساگ یعنی دنداسہ لانا بھول گئے تو جناب لڑکا دوڑایا گیا۔ وہ مساگ لے آیا تب ختم دلایا گیا۔"(8)

"گنجی بار" کے لوگوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ سے ایک دوسرے کی مدد کرنے اور ہر مشکل میں ساتھ دینے والوں کی نسبت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی ثقافت میں یہ شامل ہے کہ چاہے خوشی ہو یا غم اپنے لوگوں کے ساتھ

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

ہمیشہ مضبوط دیوار بن کر کھڑے ہونا ہے۔ اس کے جہاں بہت سے فوائد ہیں وہی کچھ نقصانات بھی ہیں۔ فوائد یہ ہے کہ کبھی بھی کوئی شخص خود کو اکیلا نہیں سمجھتا اور ہر مشکل کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ چونکہ اس علاقے کے لوگ بہت جذباتی ہیں اور جذباتی شخص عقل سے زیادہ لاٹھی سے کام لیتا ہے تو نقصان یہ ہے کہ لوگ جھگڑا مول لینے میں بھی ایک لمحے کی دیر نہیں کرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں ان کا ساتھ دینے کے لئے ایک ہجوم ان کے پیچھے کھڑا ہے۔

اس کے علاوہ ایک دوسرے کی خوشی غمی کے موقع پر مدد کرنا بھی ان لوگوں کی خوبی ہے کسی کی خوشی میں کوئی شامل ہو نہ ہو غم میں ہر ایک دوست اور رشتہ دار تمام گلے شکوے بھول کر پہنچ جاتا ہے۔ ہر لحاظ سے جیسے معاشرتی ترقی آئے روز ہو رہی ہے اس کا اثر ہر معاشرے پر ہو رہا ہے جس کی وجہ سے بہت سی مثبت تبدیلیاں بھی آ رہی ہیں۔ آج سے چند سال قبل جب کوئی وفات پا جاتا تھا تو اس کے لواحقین کو کپڑے جن میں عموماً سفید رنگ کی چادر اور لنگی ہوتی تھی اور کھانے پینے کی چیزیں دے کر ان کی مدد کی جاتی تھی تاکہ فوت ہونے والے شخص کے جانے سے ان کے گھر کو جو نقصان ہوا ہے اس کا کسی نہ کسی طرح سے ازالہ ہو سکے، لیکن یہ چیزیں خاص کر کثیر تعداد میں جمع ہونے والے کپڑے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے اور کئی کئی سال تک صندوقوں میں پڑے رہتے تھے اور یہ انتظار کیا جاتا تھا کہ جب کوئی اور رشتہ دار یا جاننے والا فوت ہو گا تو اسے یہی کپڑے دیے جائیں گے۔ لیکن موجودہ دور میں یہ بہتری آئی ہے کہ اب لوگ فوت ہونے والے شخص کے ورثا کو اپنی استطاعت کے مطابق رقم دیتے ہیں جو کہ ایک بہترین عمل ہے جس سے وہ اپنی ضروریات پوری کر سکتے ہیں۔ اس کے فوائد کا ذکر ناول "مانگی ہوئی محبت" میں بہت ہی خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔

> "جب کوئی فوت ہو تو اس کے لیے یعنی فوت ہونے والے کی چارپائی پر کپڑے رکھتے ہیں۔ یا لواحقین کو دے دیتے ہیں۔ مرد ہو تو لنگی یا چادر اور اگر عورت فوت ہو تو سلاری، یہ ایک قسم کا ڈوپٹہ ہوتا ہے۔ یہ پہلے پہلے رواج تھا، اب لوگوں نے سوچا کہ اتنے سارے کپڑے کیا کرنے ہیں، لوگ کپڑے کے بدلے پیسے دے دیتے ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ مرنے والے کے لواحقین کی مالی مدد ہو جاتی ہے۔ غریب لوگ ہوں تو پھر تو یہ سمجھیں کہ بہت اچھی بات ہے۔"(9)

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

ڈھولے، ٹپے، دوہڑے اور بولیاں " گنجی بار" کا اثاثہ ہیں۔ یہ تمام مقامی لوک گیت ہیں انہیں گا کر پڑھا جاتا ہے اور کبھی کبھی ویسے ہی لہر میں پڑھے جاتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کے لئے تفریح کا ایک بڑا ذریعہ یہی ڈھولے، ٹپے اور بولیاں ہیں۔ ان کو خاص انداز میں پڑھنے کے لئے کچھ لوگ پہچانے جاتے ہیں جنہیں مقامی لوگ مراسی کہتے ہیں۔ شام کو ڈیروں میں بیٹھتے مراسیوں کو باقاعدہ بلایا جاتا ہے اور ان سے لوک گیت سنے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ بکریاں چرانے والے چرواہے بھی اس کام میں ماہر سمجھے جاتے ہیں چونکہ وہ زیادہ وقت اکیلے اور باہر سنسان جگہوں پر گھومتے ہیں تو ان کے پاس خود کو تازہ دم رکھنے اور بوریت بھگانے کے لئے یہ بہت کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ میلوں پر بھی ایک بڑے ہجوم کے درمیان کھڑے ہو کر دوہڑے اور ڈھولے پڑھے جاتے جن کو سننے کے لئے شائقین بڑی تعداد میں، جن میں زیادہ بوڑھے بابے ہوتے تھے جمع ہو جاتے۔ اس سے جہاں ایک فائدہ یہ تھا کہ لوگوں کو تازہ دم ہونے کا موقع مل رہا تھا وہیں اس کی مالی مدد بھی ہو رہی تھی کیونکہ جب لوگ اس کی مدھر آواز سنتے تو خوش ہو کر اسے پیسے دیتے اور یہی وجہ تھی کہ کئی لوگوں نے اسے ذریعہ معاش بنالیا۔ ناول میں ہمیں نور بخش اور اس کا باپ دو ایسے کردار دیکھنے کو ملتے ہیں جن کہ ذریعے نا صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام نسل در نسل منتقل ہوتا تھا بلکہ ڈھولوں کی اقسام کا بھی پتہ چلتا ہے۔

> نورو کا باپ اکثر میلوں پر پرانے بابوں کے درمیان کھڑے ہو کے ڈھولے گاتا ہوتا تھا۔ اُس نے اپنے باپ کے مرنے کے بعد اس سے یاد کیے ہوئے ڈھولے گانے شروع کر دیئے تھے ۔احمد خان کھرل کے انگریزوں کے خلاف لڑوائیوں کے ڈھولے ،کال بلیندی اے ۔۔۔۔، حضرت یوسف کے قصے والے ڈھولے ، اور کچھ اس کے اپنے تخلیق کردہ سوز بھرے ڈھولے۔ نورو میلوں پر تو نہیں پڑھتا تھا لیکن اکثر وہ بیلے میں اکیلا ہی گاتا پھرتا رہتا تھا۔ ہجر و فراق کے ڈھولے پڑھتے پڑھتے وہ آبدیدہ ہو جاتا تھا۔ اِسے وہ اپنے باپ کی یاد سے موسوم کرتا تھا۔ (10)

پنجابی پاکستان میں 55 فیصد لوگوں کی مادری زبان ہے اور اس کو بولنے والوں کی تعداد 65 فیصد ہے۔ تقریباً 10 کڑوڑ لوگ پاکستان میں پنجابی بولتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود افسوس کی بات ہے کہ پنجاب میں سرکاری طور پر کوئی

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

خاص اہمیت حاصل نہیں ہے۔ پنجابی تو بڑی دور کی بات ہے ہم ایسی قوم ہیں جو ابھی تک فیصلہ نہیں کر پا رہے کہ ہم سب کو کس مقام پر اکھٹے ہونا ہے اور شاید ہمیں اکھٹا ہونا سکھایا ہی نہیں گیا۔ پاکستان وہ واحد ملک ہے جس کی قومی زبان اردو، دفتری زبان انگریزی اور ایک کثیر تعداد کی مادری زبان پنجابی ہے۔

ان تمام عوامل کا نقصان آنے والی نسلوں کو ہو رہا ہے۔ ان میں دو درجے آتے ہیں ایک تو ایسے جنہیں ہم مڈل کلاس کہتے ان کے بچے گھر میں پنجابی سنتے ہیں، والدین ان سے اردو بولنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں اور سکول والے انگلش بولنے پر مجبور کرتے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے بچے کو کسی ایک بھی زبان پر عبور حاصل نہیں ہوتا اور وہ تینوں زبانوں کو ملا کر بولنے پو مجبور ہو جاتا ہے۔ دوسرے درجے وہ لوگ آتے ہیں جو اپر کلاس کہلاتے ہیں ان کے بچوں کو گھر میں اور سکول میں پورا انگریزی ماحول ملتا ہے جس کا نقصان یہ ہوتا کہ وہ بچے عام معاشرے میں گفتگو کر نہیں سکتے اور اگر کریں تو ہر آدمی انہیں سمجھ نہیں پاتا جس سے ان کی خود اعتمادی کو ٹھیس پہنچتی ہے۔

"گنجی بار" کے علاقے میں بولی جانے والی زبان بھی پنجابی جو لہجے کے لحاظ سے "ماجھی" کہلاتی ہے۔ پنجابی کے کئی لہجے ہیں جن میں ماجھی، مالوی، دوآبی، ڈوگری، پہاڑی، پوٹھوہاری، ہندکو، شاہپوری اور جھنگوچی شامل ہیں۔ ماجھی پنجابی کا سب سے وسیع لہجہ ہے۔ اس میں ایک مٹھاس پائی جاتی ہے اور اسے دوسری زبان کے لوگوں کے لئے سمجھنا بھی بے حد آسان ہے۔

جیسا کے ناول "مانگی ہوئی محبت" میں "محمد اقبال عابد" بار بار ثقافتی منظر پیش کر رہے ہیں اسی طرح انہوں نے پنجابی زبان کی بھی ثقافت اور مٹھاس کا عنصر شامل کیا ہے۔ جس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے لوگ اپنی زبان سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ غوث جب آرزو کی تلاش میں گم سم کھڑا ہوتا ہے تو سکینہ اسے کہتی ہے کہ۔

> "بھاؤ جیس ویلے مہ جبیں بھَں بَ۔۔ نوں اِتراض کوئی نہیں۔ ہَتھوں اوہ آپ مُڑ مُڑ آہدی اے، تاں سیاں کیوں گھسیندے ہوہ؟ پتا تاں کرو۔ اللہ کریسی باجی آرزو تہاڈے انتظار اچ ہوسی۔"(11)

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

"محمد اقبال عابد" کے ناول "مانگی ہوئی محبت" کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا کہ وہ کس طرح اپنی ثقافت میں رچے بسے ہوئی ہیں۔ انہوں نے ڈیرے پر بیٹھنے والے لوگوں، کپاس چنتی خواتین اور جب کوئی وفات پا جائے تو اس ماحول میں ہونے والی باتوں سمیت ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو نمایاں کیا ہے۔ قاری ناول پڑھنے کے دوران کسی قسم کی اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا۔ عموماً تاریخی یا ثقافتی تحریر پڑھتے وقت بوریت محسوس ہوتی ہے لیکن "محمد اقبال عابد" کی یہ خوبی ہے انہوں نے اتنی خوبصورتی سے کہانی کو پیش کیا ہے کہ وہ دلچسپ بن گئی ہے۔

جغرافیائی لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی انہوں نے پورا انصاف پرتا ہے۔ انہوں نے باروں سے لے کر دریاؤں تک اور کھنڈرات سے لے کر بولی اور رسموں رواجوں تک ہر چیز کو اپنی کہانی میں سمویا ہے۔ وہ رچناوی تہذیب کی گہرائیوں میں گئے ہیں اور ہمیں ہر گلی محلے، کوچے میں گھومتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے کھانے پینے، پہناوے، گفتگو کے انداز اور لوگوں کی عادات سے تمام پڑھنے والوں کو متعارف کروایا ہے۔

"محمد اقبال عابد" کی ایک اور خوبی یہ ہے انہوں نے جہاں خوبصورتی، تاریخ اور محبت کے قصے چھیڑیں ہیں وہیں انہوں نے معاشرے کی بدکاریوں، فضول رسموں اور برائیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ لوگ اپنی ضروریات کے مطابق اسلامی اور تاریخی روایات کو پامال کرتے ہیں اور ان میں اپنی ضرورت کی چیزیں نکالنے اور باقی تمام تہذیبی و اسلامی روایات کو ٹھوکر مارنے میں دیر نہیں لگاتے۔ انہوں نے عام لوگوں کی زندگی کو انتہائی ہی خوبصورت انداز میں اپنا موضوع بنایا ہے۔

اسلوب کے لحاظ سے ناول اپنا مقام الگ رکھتا ہے۔ "محمد اقبال عابد" نے بہت ہی سادہ زبان میں اپنے تمام خیالات کاغذ پر اتارے ہیں۔ قاری کو پڑھتے وقت ان کے انداز بیان کی وجہ سے کہیں رکاوٹ نہیں آتی بلکہ ایسی روانی آتی ہے کہ دل چاہتا ہے ایک ہی نشست میں پورا ناول پڑھ لیا جائے۔ ناول میں جزیات نگاری، مکالمہ نگاری، منظر کشی اور خاکہ نگاری میں ایک سحر انگیز انداز اپنایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کو ہر فقرے، لائن اور پیرا گراف کو غور سے پڑھنے پر مجبور کرتے ہیں۔

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

ناول میں "غوث" اور "آرزو" نامی دو کردار ہیں جن کے ذریعے پوے "گنجی بار" کی ثقافت اور تاریخ کو دکھایا گیا ہے۔ ناول پڑھتے وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ مصنف اور قاری دونوں "غوث" اور "آرزو" کے ساتھ ساتھ گھوم رہے ہیں اور تمام چیزوں کو دیکھنے اور سمجھنے کے ساتھ ساتھ تہذیب اور تاریخ سے آگاہی ملتی ہے۔ انہوں نے پنجائت کا ماحول، لڑائی جھگڑے، بات چیت، لوگوں کی سادہ دلی اور معصومیت کو کہانی میں ڈھال کر انہیں ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا ہے۔ پروفیسر غلام حسین ساجد ناول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ۔

> "سخت مشکل میں ہوں کہ پروفیسر محمد اقبال عابد کے ناول "مانگی ہوئی محبت" کو کس زمرے میں رکھوں کہ اس میں تہذیب، تصوف، تمثیل اور تعقل باہم محبت ہو کر ایک دوسرے کا بدل بن گئے ہیں اور اس کی کتھا، سرزمین، دانش اور بیان میں قاری کے باطن کو بدل دینے کی طاقت ہے۔ میں فکشن سے خاصی دلچسپی رکھتا ہوں اور اسلوب کئی انوکھے مظاہر میری نگاہ میں ہیں مگر جیسی دل پذیر روانی اور کن سن سے درست لطافت اور شگفتی اس ناول کے ئ بیانیے میں ہو کم یاب ہی نہیں نایاب ہے۔ (12)

"محمد اقبال عابد" ہمیں دکھاتے ہیں کہ سادہ طبیعت رکھنے والے لوگ کتنے معصوم ہوتے ہیں ان کے رکھ رکھاؤ، ان کا انداز بیان اور ان کی سادگی تمام چیزیں ایک خوبصورت گلدستے کی اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن موجودہ دور میں وہ تمام چیزیں نہیں اب تو کسی کو کسی دوسرے کی پرواہ ہی نہیں ہر بندہ اپنا مطلب پورا کرنے کے چکر میں گھومتا نظر اور ہر لمحے یہ سوچتا ہے سامنے والے کو دوست بنا کر کس قدم پر دھوکا دینا ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے بہت کم لوگ ہیں جو اپنے آباؤ اجداد کی عزت کو محفوظ کرنے اور تمام روایات کو اپنانے اور ان کو پامال ہونے سے بچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں تو محبت جیسا پاکیزہ رشتہ بھی تار تار ہو چکا ہے اب محبت کے نام پر اپنی ضروریات پوری کی جاتی ہیں۔ ان ضروریات میں مال و دولت ہو یا پھر جنسی خواہشات صرف انہیں کو پورا کرنا محبت ہے اور اگر ان میں سے کوئی چیز نہیں مل رہی تو اس کا مطلب ہے کہ محبت نہیں ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ آئے روز اس میں اضافہ ہوتا جا رہا اور ہماری نسلیں اپنی ثقافت اور عزتوں کو پامال کرنے میں قلیدی کردار ادا کر رہی ہیں۔ ایسے ماحول میں "محمد اقبال عابد" غوث جیسا کردار ہمارے

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

سامنے پیش کرتے ہیں جو ہر طرح سے اپنی مٹی کے ساتھ جڑا ہوا نظر آتا ہے اور اخلاقیات کی اعلیٰ مثال پیش کرتا ہے۔ ہمیں "غوث" جیسے کئی کرداروں کی ضرورت ہے جو ہمارے معاشرے میں رہیں اور اپنا کردار ادا کر کے دوسرے لوگوں کو راہ راست پے لانے میں مدد کریں۔

"محمد اقبال عابد" ہمیں ہماری تہذیب و ثقافت سے روشناس کرواتے ہیں اور دکھاتے ہیں کہ کس طرح سے ہمارے اباؤ اجداد اپنی روایات کا تقدس کرتے تھے اور اخلاقیات کو اپنا اثاثہ سمجھتے تھے۔ ناول میں ہمیں نئے موضوع کے ساتھ ساتھ تاریخ سے بھی شناسائی کرواتے ہیں جس سے اردو ناول کی تاریخ میں ایک نئے صفر کا آغاز ہوتا نظر آتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کا ایک خاصہ یہ ہے کہ وہ وقت وقت کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور خود میں مثبت تبدیلیاں لاتے ہیں لیکن اپنے رسم و رواج کو بھی محفوظ رکھتے ہیں جو کسی بھی معاشرے کی حقیقی پہچان ہے۔ اس کے برعکس ہماری یہ بے بسی ہے کہ ہمارے ملک میں لوگ وقت کے ساتھ ساتھ بدلنے کی تو کوشش کرتے ہیں لیکن اپنی ثقافت کو محفوظ رکھنے کے لئے کوئی اہم کردار ادا نہیں کرتے جس وجہ سے ہم اپنی روایات کو بھولتے جا رہے ہیں۔ ان حالات میں ناول "مانگی ہوئی محبت" ایک اہم تہذیبی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے، جہاں محمد اقبال عابد نے تہذیب و ثقافت اور معدوم ہوتی قدروں کو خوبصورت انداز میں محفوظ کیا ہے۔

حوالہ جات

1۔ اسد سلیم شیخ، دلے دی بار، فکشن ہاؤس، لاہور، 2015، ص09

2۔ سبط حسین، سید، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، کراچی، مکتبہ دانیال، 1977، ص13

3۔ پروفیسر غلام حسین ساجد، فلیپ، مانگی ہوئی محبت، محمد اقبال عابد، ساہیوال پرنٹنگ پریس، ساہیوال، 2018

4۔ پروفیسر منیر ابن رزمی، مانگی ہوئی محبت۔۔۔۔ جاگتی آنکھوں کا خواب، (مشمولہ) مانگی ہوئی محبت، محمد اقبال عابد، ساہیوال پرنٹنگ پریس، ساہیوال، 2018، ص04

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

5۔ محمد اقبال عابد، مانگی ہوئی محبت، ساہیوال پرنٹنگ پریس، ساہیوال، 2018، ص61

6۔ ایضاً، ص41

7۔ ایضاً، ص88

8۔ ایضاً، ص174

9۔ ایضاً، ص175

10۔ ایضاً، ص271

11۔ ایضاً، ص418

12۔ پروفیسر غلام حسین ساجد، فلیپ، مانگی ہوئی محبت، محمد اقبال عابد، ساہیوال پرنٹنگ پریس، ساہیوال، 2018